جلوۂ ایثار

1

وندھیا چل پہاڑ آدھی رات کی ڈراؤنی تاریکی میں کالے دیو کی طرح کھڑا تھا۔ اس پر اگے ہوئے چھوٹے چھوٹے درخت ایسے نظر آتے تھے گویا کہ اس کی جٹائیں ہیں اور اشٹ بھجی دیوی کا مندر جس کے کلس پر سیاہ پتاکے ہوا کے دھیمے دھیمے جھونکوں سے لہرا رہے تھے، اس دیو کا سر معلوم ہوتا تھا۔ مندر میں ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ نظر آتا تھا جس پر کسی دھندلے تارے کا گمان ہوتا تھا۔

آدھی رات گزر چکی تھی، چاروں طرف ہیبت ناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گنگا جی کی سیاہ لہریں پہاڑ کے نیچے سکون بخش روانی سے بہہ رہی تھیں اور ان کے بہاؤ سے ایک دلآویز نغمہ کی صدا نکل رہی تھی۔ جا بجا کشتیوں پر اور کناروں کے آس پاس ملاحوں کے چولہوں کی آنچ نظر آ جاتی تھی۔ ایسے وقت میں ایک سفید پوش عورت اشٹ بھجی دیوی کے سامنے ہاتھ باندھے بیٹھی تھی۔ اس کا متین چہرہ زرد تھا اور بشرے سے شرافت برستی تھی۔ اس نے دیر تک سر جھکانے کے بعد کہا:

ماتا! ''آج بیس سال سے کوئی منگل کا دن ایسا نہیں گزرا کہ میں نے چرنوں میں سر نہ جھکایا ہو۔ ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا کہ میں نے تمہارے چرنوں کا دھیان نہ کیا ہو۔ تم جگ تارنی مہارانی ہو، مگر تمہاری اتنی سیوا کرنے پر بھی میرے دل کی آرزو پوری نہ ہوئی۔ میں تمہیں چھوڑ کر اب کہاں جاؤں؟''

ماتا! میں نے سینکڑوں برت رکھے۔ دیوتاؤں کی اپاسنائیں کیں، تیرتھ جاترائیں کیں مگر منورتھ پورا نہ ہوا۔ تب تمہارے شرن آئی۔ اب تمہیں چھوڑ کر کہاں جاؤں۔ تم نے سدا اپنے بھگتوں کی مرادیں پوری کی ہیں۔ کیا میں تمہارے دربار سے نراش جاؤں؟

سبھاما اسی طرح دیر تک بنتی کرتی رہی کہ یکا یک اس کے دل پر بے خبر کر دینے والی

محویت کا غلبہ ہوا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور کان میں آواز آئی۔

''سباما! میں تجھ سے بہت خوش ہوں، مانگ کیا مانگتی ہے''

سباما کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور کلیجہ دھڑکنے لگا کہ آج بیس سال کے بعد مہارانی نے روشن دیئے۔ کانپتے ہوئے بولی۔

''جو کچھ مانگوں گی وہ مہارانی دیں گی؟''

''ہاں ملے گا''

''میں نے بھاری تپسیا کی ہے، اس لیے بڑا بھاری بردان مانگوں گی''

''کیا لے گی؟ کبیر کا دھن؟''

''نہیں''

''اندر کا بل؟''

''نہیں''

''سرسوتی کی ودیا؟''

''نہیں''

''سنسار کا سب سے اتم پدارتھ؟''

''نہیں''

''وہ کیا ہے؟''

''سپوت بیٹا''

''جو کل کا نام روشن کرے''

''نہیں''

''جو ماں باپ کی سیوا کرے''

''نہیں''

''جو ودیاوان اور بلوان ہو؟''

''نہیں''

''پھر سپوت بیٹا کسے کہتی ہے؟''

''جو اپنے دیش کا اپکار کرے''

''تیری بدھی کو دھنیہ ہے۔ جا تیری اچھا پوری ہوگی''

2

ویراگ

منشی سالگرام بنارس کے پرانے رئیس تھے۔ پیشہ وکالت کا اور موروثی جائیداد افرتھی، وسا سمیدھ گھاٹ پر ان کا عالیشان مکان آسمان سے باتیں کرتا تھا۔ فیاض ایسے کے پچیس تیس ہزار سالانہ کی آمدنی خرچ کو کافی نہ ہوتی۔ سادھوؤں اور برہمنوں کے پکے معتقد تھے۔ جو کچھ کماتے برہم بھوج اور سادھوؤں کی تواضع وتکریم میں صرف ہو جاتا۔ شہر میں کوئی سادھر آجائے، کوئی مہاتما آجائے، وہ منشی جی کا مہمان تھا۔ سنسکرت کے ایسے عالم کہ بڑے بڑے پنڈت ان کا لوہا مان چکے تھے۔ ویدانت کے اصولوں کے پابند تھے اور طبیعت کا میلان ویراگ کی طرف تھا۔

منشی جی کو فطرتاً بچوں سے بہت انس تھا۔ جب وہ گھر سے نکلتے تو قدرتی بچوں کا ایک لشکر ساتھ ہوتا۔ ایک بار ایک سنگدل ماں اپنے بچے کو مار رہی تھی۔ لڑکا بلک بلک کر روتا تھا۔ منشی جی سے ضبط نہ ہو سکا۔ بچے کو گود میں اٹھا لیا اور عورت کے سامنے اپنا سر جھکا لیا۔ اس دن سے اس نے لڑکے کو مارنا چھوڑ دیا اور نہ مارنے کی قسم کھالی۔ جو شخص غیروں کا ایسا دلدادہ ہو وہ اپنے بچے کو کتنا پیار کرے گا۔ اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ جب سے بچہ پیدا ہوا منشی جی دنیا کے کاموں سے کنارہ کش ہو گئے۔ کہیں ہنڈولے میں جھلا رہے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں۔ کہیں اسے خوشنما سیر گاڑی میں بٹھا کر خود کھینچ رہے ہیں۔

سبھا نے لڑکے کا نام پرتاب چند رکھا تھا اور جیسا اس کا نام تھا، ویسے ہی اس کے

اوصاف تھے۔ بلا کا ذہین، نہایت خوش رو باتیں کرتا تو سننے والے محو ہو جاتے۔ ستارۂ بلندی پیشانی پر چمکتا تھا۔ اعضاء ایسے قوی کہ دو گنے قد و قامت کے لڑکوں کی کچھ حقیقت نہ سمجھتا۔ اس کمسنی میں اس کا چہرہ ایسا روشن اور متین تھا کہ یکا یک کسی غیر شخص کے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا تو وہ حیرت سے تکنے لگتا تھا۔

اس طرح ہنستے کھیلتے چھ برس گزر گئے۔ عیش کے دن ہوا کی طرح سن سے گزر جاتے ہیں، کہ خبر نہیں ہوتی۔ وہ سیاہ بختی کے دن اور مصیبت کی راتیں جو کاٹے نہیں کٹتیں، آ گئیں۔ پرتاپ کے پیدا ہوئے ابھی کتنے دن گزرے! مبارکباد کی دلآویز صدائیں کانوں میں گونج ہی رہی تھیں کہ چھٹی سالگرہ آ پہنچی اور چھٹے سال کا خاتمہ برے دنوں کا آغاز تھا۔ منشی سالگرام کا دنیاوی تعلق محض نمائشی تھا۔ وہ بے لوث اور بے لگاؤ زندگی بسر کرتے تھے۔ اگرچہ ظاہر بیں نگاہوں میں معمولی دنیا داروں کی طرح دنیا کی کلفتوں سے رنجیدہ اور خوشیوں سے خوش نظر آتے تھے۔ مگر ان کا دل ہمیشہ اس اعلیٰ اور پرسکون امن کے مزے لیا کرتا تھا جس پر رنج کے جھونکوں اور خوشی کی تھپکیوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

ماگھ کا مہینہ تھا۔ الہ آباد میں کنبھ کا میلا تھا۔ ریل گاڑیوں میں جاتری روئی کی طرح بھر بھر کر الہ آباد پہنچائے جا رہے تھے۔ اسی اسی برس کے بڈھے جنہیں برسوں سے اٹھنا دوبھر تھا، لنگڑاتے، لاٹھیاں ٹیکتے منزلیں طے کر کر کے پریاگ راج کو جا رہے تھے۔ بڑے بڑے سادھو مہاتما جن کے درشنوں کی خواہش لوگوں کو ہمالیہ کی تاریک گھپاؤں میں کھینچ لے جاتی تھی، اس وقت گنگا جی کی پاک لہروں سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ منشی سالگرام کا بھی جی للچایا۔ سبھا سے بولے ''کل اشنان ہے''

سبھا: ''سارا محلّہ سونا ہو گیا ہے، کوئی آدمی نظر نہیں آتا''

منشی: ''تم چلنے پر راضی نہیں ہوتیں ورنہ بڑا لطف آتا۔ ایسا میلہ تم نے کبھی نہ دیکھا ہوگا''

سبھا: ''ایسے میلوں سے میرا جی گھبراتا ہے''

منشی: ''میرا جی نہیں چاہتا۔ جب سے سنا ہے کہ سوامی پرمانند جی آئے ہوئے ہیں۔ میرا تو دل ان کے درشن کے لیے بےقرار ہے''

سبھا پہلے تو ان کے جانے پر راضی نہ ہوئی مگر جب دیکھا کہ یہ روکے نہیں رکیں گے تب مجبوراً مان گئی۔ اسی دن گیارہ بجے رات کو منشی جی پریاگ راج چلے۔ چلتے وقت پرتاپ کا بھوسہ لیا اور بیوی کو پیار سے گلے لگالیا۔ سبھا نے اس وقت دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں۔ اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ جیسے چیت کے مہینے میں کالی کالی گھٹاؤں کو دیکھ کر کسان کا کلیجہ کانپنے لگتا ہے، اسی طرح منشی جی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر سبھا لرز گئی۔ آنسو کی وہ بوندیں ویراگ اور تیاگ کا اتھاہ سمندر تھیں۔ دیکھنے میں وہ کیسے ننھے پانی کے قطرے تھے مگر کیسے گہرے! اور کیسے وسیع! ادھر منشی جی باہر نکلے اور سبھا نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ کسی نے اس کے دل میں کہا کہ اب تجھے اپنے پتی کے درشن نہ ہوں گے۔ دو دن گزر گئے۔ تین دن گزرے۔ چوتھا دن آیا اور چلا گیا۔ یہاں تک کہ پورا ایک ہفتہ گزر گیا، اور منشی جی نہ لوٹے، تب تو سبھا کو بےکلی ہونے لگی۔ تار دیئے۔ آدمی دوڑائے، مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ دوسرا ہفتہ بھی دواڈش میں ختم ہو گیا اور منشی جی کی واپسی کی جو کچھ رہی سہی امیدیں تھیں خاک میں مل گئیں۔

منشی جی کا مفقود الخبر ہونا نہ صرف ان کے خاندان بلکہ سارے شہر کے لیے افسوسناک واقعہ تھا۔ بازاروں میں، دکانوں میں، نشست گاہوں میں غرض ہر چار طرف یہی مرکز گفتگو تھا۔ جو سنتا افسوس کرتا۔ کیا امیر کیا غریب یہ ماتم عام تھا۔ ان کی ذات سے چاروں طرف جو زندہ دلی پھیلی رہتی تھی۔ اب ایک ماتم چھایا ہوا تھا۔ جن گلیوں سے وہ بچوں کی فوج لے کر نکلتے تھے وہاں اب خاک اڑ رہی تھی۔ بچے بار بار ان کے پاس آنے کے لیے روتے اور ضد کرتے۔ ان بےچاروں کو کیا خبر تھی کہ اب

وہ محفل ویران ہوگئی۔ ان کی مائیں آنچل سے منہ ڈھانپ ڈھانپ کر روتیں۔ جیسے ان کا کوئی عزیز مر گیا ہو۔

یوں تو منشی جی کے غائب ہونے کا رونا سب ہی رو رہے تھے۔ مگر سب سے گاڑھے آنسو آڑھتیوں اور سوداگروں کی آنکھوں سے نکلتے تھے جن کا ابھی حساب کتاب نہیں ہوا تھا۔ دس بارہ دن تو انہوں نے جوں توں کر کے صبر کیا۔ مگر آخر کب تک؟ ایک ایک کر کے حساب کی فردیں پیش ہونے لگیں۔ کبھی برہم بھوج میں دوسو روپیہ کا گھی آیا ہے اور قیمت نہیں دی گئی ہے۔ کہیں سے دومن میدہ آیا ہوا ہے۔ مندر بنواتے وقت ایک مہاجن سے بیس ہزار روپیہ قرض لیا گیا تھا، وہ ابھی جوں کا توں پڑا ہوا ہے۔ مطالبات کا تو یہ حال تھا اور اثاثہ کا یہ حال تھا کہ بجز ایک عالیشان عمارت اور اس کے لوازمات کے کوئی ایسی جائیداد نہ تھی جس سے کوئی کثیر رقم کھری ہو سکے۔ تدبیر یہ تھی کہ علاق نیلام پر چڑھایا جائے اور اس کے محاصل سے مطالبات ادا کیے جائیں۔

بے چاری سباما سر جھکائے بوریے پر بیٹھی ہوئی تھی اور پرتاپ چند اپنے لکڑی کے گھوڑے پر سوار آنگن میں ٹخ ٹخ کر رہا تھا کہ پنڈت موٹے رام شاستری جو خاندان کے پروہت تھے، مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ انہیں خوش دیکھ کر مایوس سباما چونک کر اٹھ بیٹھی کہ شاید کوئی خوشخبری لائے ہیں۔ ان کے لیے آسن بچھایا اور پرامید نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ پنڈت جی آسن پر بیٹھے اور سونگھنی سونگھتے ہوئے بولے۔ ''تم نے مہاجنوں کا حساب دیکھا؟''

سباما: (مایوسانہ لہجے میں) ''ہاں دیکھا تو''

موٹے رام: ''رقم بڑی گہری ہے۔ منشی جی نے آگا پیچھا کچھ نہ سوچا۔ اپنے یہاں کوئی حساب کتاب نہ رکھا۔''

''ہاں اب تو رقم گہری ہے، نہیں تو اتنا روپیہ ایک ایک بھوج میں اٹھ گیا کیا؟''

موٹے رام: ''سب دن برابر نہیں جاتے''

سبھا: ''اب تو جو ایشور کرے گا وہ ہوگا، میں کیا کر سکتی ہوں''

موٹے رام: ''ہاں ایشور کی اچھا تو مول ہی ہے۔ مگر تم نے بھی کچھ سوچا ہے؟''

سبھا: ''ہاں علاقہ نیلام کر دوں گی''

موٹے رام: ''رام رام یہ کیا کہتی ہو علاقہ بک گیا تو پھر بات کیا رہ جائے گی''

سبھا: ''اس کے سوا اب کوئی تدبیر نہیں ہے''

موٹے رام: ''بھلا علاقہ ہاتھ سے نکل گیا تو تم لوگوں کا گجر بسر کیسے ہوگا؟''

سبھا: ''ہمارا ایشور مالک ہے، وہی بیڑا پار کرے گا''

موٹے رام: ''یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے کہ ایسے اپکاری آدمی کے لڑکے بالے دکھ اٹھائیں''

سبھا: ''ایشور کو یہی منظور ہے تو کسی کا کیا بس؟''

موٹے رام: ''بھلا میں ایک جگت بتاؤں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے''

سبھا: ''ہاں بتائیے آپ کا بڑا اپکار ہوگا''

موٹے رام: ''پہلے تو ایک درکھاس لکھوا کر کلکٹر صاحب کو دے دو کہ مالگجاری معاف کی جائے۔ باقی روپیہ کا بندوبست ہمارے اوپر چھوڑ دو، ہم جو چاہیں گے کریں گے، مگر علاقے پر آنچ نہ آنے پائے گی''

سبھا: ''کچھ معلوم ہو تو آپ اتنا روپیہ کہاں سے لائیں گے؟''

موٹے رام: ''تمہارے لیے روپیہ کا کلیان، منشی کے نام پر بتا لکھا پڑھی کے پچاس ہزار روپیہ کا بندوبست ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ روپیہ لکھا ہوا ہے تمہارے منہ سے ہاں نکلنے کی دیر ہے''

سبھا: ''شہر کے رئیسوں نے جمع کیا ہوگا''

موٹے رام: ''ہاں بات کی بات میں روپیہ جمع ہو گیا۔ صاحب کا اشارہ بہت تھا''

سباما: (کچھ سوچ کر) ''معافی کی درخواست مجھ سے نہ لکھوائی جائے گی اور نہ اپنے پتی کے نام پر قرض لینا چاہتی ہوں، میں سب کا ایک ایک پیسہ علاقہ سے ادا کروں گی''

یہ کہہ کر سباما نے رکھائی کے ساتھ منہ پھیر لیا، اور اس کے زرد اور افسوسناک چہرے پر ہلکا سا غصہ دکھائی دیا۔ موٹے رام نے دیکھا بات بگڑا چاہتی ہے تو سنبھل کر بولے۔

''اچھی جیسی تمہاری مرضی، اس میں کوئی جبر دستی نہیں ہے۔ مدا ہم نے تم کو کسی طرح کا دکھ اٹھاتے دیکھا تو اس دن پر لے ہو جائے گا، بس اتنا سمجھ لو''

سباما: ''تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں اپنے پتی کے نام پر دوسروں کے احسان کا بوجھ رکھوں۔ میں اسی گھر میں مروں گی، فاقے کرتے کرتے مر جاؤں گی، مگر کسی کا احسان نہ اٹھاؤں گی''

موٹے رام ''چھی چھی! تمہارے اوپر احسان کون کرتا ہے، کیسی بات منہ سے نکالتی ہو؟ کرج لینے میں کوئی سرم نہیں ہے۔ کون رئیس ہے جس پر لاکھ دو لاکھ کا کرج نہ ہو''

سباما: ''مجھے یقین نہیں آتا کہ اس قرض میں احسان شامل نہیں ہے''

موٹے رام: ''سباما! تمہاری بدھی کہاں گئی ہے، بھلا تم سب طرح کے دکھ اٹھا لو گی، مگر کیا تمہیں اس بالک پر ترس نہیں آتا''

موٹے رام کی یہ چوٹ کاری پڑی۔ سباما آب دیدہ ہو گئی اور بیٹے کی طرف پر حسرت نگاہوں سے دیکھا۔ اس بچے کے لیے کون کون سی تپسیا نہیں کی۔ کیا اب اس کی تقدیر میں دکھ اٹھانا لکھا ہے۔

جو پودا کل ہوا کے تیز جھونکوں سے بچایا جاتا تھا، جس پر کبھی آفتاب کی تیز کرنیں نہ

پڑنے پاتی تھیں، جو تر تازگی کے ہنڈولے میں جھول رہا تھا۔ کیا وہ آج اس جلتی ہوئی دھوپ اور اس آگ کی لپیٹ میں مرجھا جائے گا۔ سبھا کئی منٹ تک اسی فکر میں بیٹھی رہی۔ موٹے رام دل میں خوش ہو رہے تھے کہ اب بازی مار لی۔ اتنے میں سبھا نے سر اٹھایا اور بولی۔ ''جس کے باپ نے لاکھوں کو پلایا کھلایا وہ دوسروں کی آسریت نہیں بن سکتا۔ اگر آپ کا دھرم اس کی مدد کرے گا تو وہ خود دس کو کھلا کر کھائے گا (لڑکے کو بلاتے ہوئے) بیٹا ذرا ادھر یہاں آؤ۔ کل سے تمہاری مٹھائی بند، دودھ گھی سب بند ہو جائے گا، روؤ گے تو نہیں'' یہ کہہ کر اس نے بیٹے کو پیار سے گود میں بٹھایا اور اس کے گلابی رخساروں سے پسینہ پونچھ کر ایک بوسہ لیا۔

پرتاپ: ''کیا کہا کل سے مٹھائی بند ہوگی۔ کیوں، کیا حلوئی کی دوکان میں مٹھائی نہیں ہے؟''

سبھا: ''مٹھائی تو ہے مگر اس کا روپیہ کون دے گا؟''

پرتاپ: ''ہم بڑے ہوں گے تو اس کو بہت روپیہ دیں گے۔ چل لخ لخ دیکھوں اماں کیسا تیز گھوڑا ہے'' سبھا کی آنکھوں میں پھر آنسو امڈ آئے، افسوس! کیا اس حسن و نزاکت کے پتلے پر ابھی سے افلاس کی مصیبتیں آجائیں گی۔ نہیں نہیں، میں خود سب بھگت لوں گی مگر اپنے پیارے بچے پر مصیبت کی پرچھائیں نہ آنے دوں گی۔ ماں تو یہ خیال کر رہی تھی اور پرتاپ اپنے منہ زور بدلگام اسپ چوبیں کو زیر کرنے میں ہمہ تن مصروف تھا۔ بچے تو ہوتے ہیں دل کے بادشاہ! الغرض موٹے رام نے بہت کچھ جال پھیلایا۔ اور بہت فصاحت و بلاغت صرف کی مگر سبھا نے ایک دفعہ نہیں کر کے ہاں نہ کی۔ اس کی وضعداری کا تذکرہ جس نے سنا واہ واہ کی۔ لوگوں کے دل و دماغ میں اس کی عزت دوچند ہوگئی۔ اس نے وہی کیا جو ایسے سیر چشم اور دریا دل آدمی کی بیوی کے شایان شان تھا۔

اس کے پندرہویں دن علاقہ نیلام پر چڑھا۔ پچاس ہزار کی رقم وصول ہوئی، کل

مطالبے چکا دیئے گئے، گھر کا بے ضرورت سامان فروخت کر دیا گیا۔ مکان میں بھی سہاما نے اندر سے اونچی اونچی دیواریں کھنچوا کے دو علیحدہ درجے کیے۔ ایک میں خود رہنے لگی اور دوسرا کرایہ پر اٹھا دیا۔

3

نئے پڑوسیوں سے میل جول

منشی سنجیون لال جنہوں نے سہاما کا مکان کرایہ پر لیا تھا، اعلیٰ درجہ کے روشن خیال آدمی تھے۔ پہلے ایک سرکارہ عہدہ پر ممتاز تھے۔ مگر اپنی آزاد طبیعت کے باعث افسروں کو خوش نہ رکھ سکے۔ یہاں تک کہ ان کی ناراضگی سے تنگ آ کر استعفیٰ دے دیا۔ دوران ملازمت تھوڑا سا سرمایہ فراہم کر لیا تھا، نوکری چھوڑتے ہی ٹھیکہ داری کی طرف رجوع کیا اور اپنی محنت و جانفشانی سے تھوڑے ہی عرصہ میں اچھی حالت بنا لی۔ اس وقت ان کی آمدنی چار پانچ سو کی اوسط سے کم نہ تھی۔ ایسی معاملہ فہم طبیعت پائی تھی کہ جس تعمیر میں ہاتھ لگاتے نفع کے سوا نقصان نہ ہوتا۔

منشی سنجیون لال کا کنبہ بہت بڑا نہ تھا۔ اولادیں تو ایشور نے کئی دیں مگر وہ سب بچپنے میں ہی داغ مفارقت دے گئیں تھیں۔ اب اس وقت ماں باپ کی آنکھوں کی پتلی صرف ایک لڑکی تھی۔ اس کا نام برج رانی تھا اور وہی والدین کی زندگی کا سہارا تھا۔

پرتاپ چند اور برج رانی میں پہلے ہی دن سے دوستی شروع ہو گئی۔ آدھ گھنٹے میں دونوں چڑیوں کی طرح چہکنے لگے۔ برجن نے اپنی گڑیاں، کھلونے اور باجے دکھائے اور پرتاپ نے اپنی کتابیں، قلم اور تصویریں پیش کیں۔ برجن کی ماں سوشیلا نے پرتاپ کو گود میں لے لیا اور خوب پیار کیا۔ اس دن سے وہ روز شام کو آتا۔ دونوں ہمجولی ساتھ ساتھ کھیلتے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ دونوں بھائی بہن ہیں۔ سوشیلا دونوں بچوں کو گود میں اٹھا لیتی اور ان کو گھنٹوں پیار کرتی اور گھنٹوں ٹکٹکی لگائے دونوں

بچوں کو دیکھا کرتی۔ برجن بھی پرتاپ کے گھر کبھی کبھی جاتی۔ مصیبت کی ماری سبھا اسے دیکھ کر اپنی مصیبت بھول جاتی۔ اسے چھاتی سے لگا لیتی اور اس کی بھولی بھالی باتیں سن کر اپنا غم غلط کرتی۔

ایک روز منشی سنجون لال باہر سے آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ پرتاپ اور برجن دونوں دفتر میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ پرتاپ کوئی کتاب پڑھ رہا ہے اور برجن دھیان لگائے سن رہی ہے۔ دونوں نے جونہی منشی جی کو دیکھا اٹھ کھڑے ہوئے۔ برجن تو دوڑ کر باپ کی گود میں جا بیٹھی اور پرتاپ سر نیچا کر کے کھڑا ہو گیا۔ کیسا ذی شعور لڑکا تھا۔ سن ابھی آٹھ سال سے زیادہ کا نہ تھا مگر بشرے سے آنے والی عظمت جھلک رہی تھی۔ روشن اور مردانہ چہرہ، پاک و صاف ہاتھ پاؤں پتلے پتلے سرخ ہونٹ تیز چلتی ہوئی نگاہیں۔ کالے کالے بھونرے کی طرح بال اور اس پر صاف ستھرے کپڑے، منشی جی نے پرتاپ سے کہا ''یہاں آؤ پرتاپ'' پرتاپ آہستہ آہستہ کچھ ہچکچاتا کچھ لجاتا قریب آیا۔ منشی جی نے پدرانہ محبت سے گود میں بٹھا لیا اور پوچھا ''تم ابھی ابھی کونسی کتاب پڑھ رہے تھے؟''

پرتاپ بولنے ہی کو تھا کہ برجن بول اٹھی ''ابا بڑی اچھی کہانیاں تھیں، کیوں بابا کیا پہلے چڑیاں بھی ہماری طرح باتیں کرتی تھیں؟''

منشی جی مسکرا کر بولے ''ہاں وہ خوب بولتی تھیں''

ابھی ان کے منہ سے پوری بات بھی نہ نکلنے پائی تھی کہ پرتاپ جس کا شرمیلا پن اب دور ہو چلا تھا۔ بول اٹھا ''نہیں برجن تمہیں بہلاتے ہیں یہ کہانیاں بنائی ہوئی ہیں''

منشی جی اس کی بے باکانہ تردید پر خوب ہنسے۔

اب تو پرتاپ بلبل کی طرح چہکنے لگا۔ اسکول اتنا بڑا ہے کہ شہر بھر کے لوگ اس میں بیٹھ جائیں۔ دیواریں اتنی اونچی ہیں جیسے تاڑ۔ بلدیو پرشاد نے جو گیند میں ہٹ لگائی

تو وہ آسمان میں چلا گیا۔ بڑے ماسٹر کی میز پر ہری ہری بانات بچھی ہوئی ہے۔ اس پر پھولوں سے بھرے گلاس رکھے رہتے ہیں۔ گنگا جی کا پانی سفید ہے، ایسے زور سے بہتا ہے کہ پہاڑ بھی ہو تو بہہ جائے۔ وہاں ایک سادھو بابا ہیں۔ ریل دوڑتی ہے سن سن اور اس کا انجن بولتا رہتا ہے بھک بھک، انجن میں بھاپ ہوتی ہے، اسی کے زور سے انجن چلتا ہے۔ گاڑی کے ساتھ ساتھ درخت بھی دوڑتے ہیں۔ اسی طرح کی باتیں پرتاپ نے اپنی بھولی بھالی زبان میں بیان کیں۔ برجن تصویر کی طرح خاموش بیٹھی ہوئی سن رہی تھی۔ ریل پر وہ بھی دو تین بار سوائی ہوئی تھی، مگر اسے آج تک یہ نہ معلوم ہوا کہ اسے کس نے بنایا اور یہ کیوں کر چلتی ہے۔ دو تین بار اس نے اپنے گرو جی سے یہ سوال کیا تھا مگر انہوں نے یہی کہہ کر ٹال دیا تھا۔ بچہ ایشور کی مہما اپرم پار ہے۔ برجن نے بھی یہی سمجھ رکھا تھا کہ ایشور کی مہا کوئی بڑا بھاری اور طاقتور گھوڑا ہے جو اتنی گاڑیوں کو سن سن کھینچے جاتا ہے۔ جب پرتاپ خاموش ہوا تو برجن نے باپ کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔ ''بابا ہم بھی پرتاپ کی کتاب پڑھیں گے''

منشی: ''بیٹی تم تو سنسکرت پڑھتی ہو، یہ تو بھاشا ہے''

برجن: ''تو میں بھی بھاشا ہی پڑھوں گی، اس میں کیسی اچھی کہانیاں ہیں۔ میری کتاب میں تو ایک کہانی بھی نہیں، کیوں بابا پڑھنا کسے کہتے ہیں؟''

منشی جی بغلیں جھانکنے لگے۔ انہوں نے آج تک خود کبھی غور نہیں کیا تھا کہ پڑھنا کیا چیز ہے، ابھی وہ سر ہی کھجا رہے تھے کہ پرتاپ بول اٹھا ''مجھے پڑھتے دیکھا؟ اسی کو پڑھنا کہتے ہیں''

برجن: ''کیا میں نہیں پڑھتی، میرے پڑھنے کو پڑھنا نہیں کہتے ہیں؟''

برجن سدھانت کومدی پڑھ رہی تھی۔ پرتاپ نے کہا ''تم طوطے کی طرح رٹتی ہو''

کچھ عرصہ سے سبا مانے گنجائش نہ دیکھ کر مہراجن، کہار اور دو مہریوں کو جواب دے دیا تھا۔ کیونکہ اب نہ تو ان کی ضرورت تھی اور نہ ان کا خرچ سنبھالے سنبھلتا تھا۔ صرف ایک بڑھیا مہری باقی رہ گئی تھی۔ اوپر کا کام کاج وہ کرتی اور کھانا سبا ما اپنے ہاتھ سے پکا لیتی۔ مگر بے چاری ایسی سخت محنت کی عادی نہ تھی۔ چند ہی دنوں میں اسے تھکن کے سبب سے رات کو حرارت رہنے لگی۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچی کہ جب دیکھیے حرارت موجود جسم پھنکا جاتا ہے۔ نہ کھانے کی طرف رغبت ہے، نہ پینے کی طرف۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ مگر وہ ہے کہ روز معمول کے موافق کام کیے جاتی ہے۔ دوا دارو کی بھی کوئی ضرورت نہیں اور نہ کسی سے اس کا ذکر کرتی ہے۔ جب تک پرتاپ گھر پر موجود رہتا ہے تب تک وہ چہرے کو ذرا بھی مدغم نہیں ہونے دیتی تھی۔ مگر جوں ہی وہ مدرسہ چلا جاتا تھا لحاف اوڑھ کر پڑی رہتی ہے اور دن بھر پڑے پڑے کراہا کرتی تھی۔

پرتاپ سمجھ دار لڑکا تھا۔ ماں کی حالت روز بروز خراب دیکھ دیکھ کر تا ڑ گیا کہ یہ بیمار ہے۔ ایک دن اسکول سے لوٹا تو سیدھا اپنے گھر گیا۔ بیٹے کو دیکھتے ہی سبا مانے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔ مگر مارے ضعف کے چکر آ گیا اور ہاتھ پاؤں اکڑ گئے۔ پرتاپ نے اسے سنبھالا اور اس کی طرف ملائمت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر بولا ''اماں تم آج کل بیمار ہو گیا؟ اتنی دبلی کیوں ہو گئی ہو؟ دیکھو تمہارا جسم کتنا گرم ہے کہ ہاتھ نہیں رکھا جاتا''

سبا مانے ہنسنے کی کوشش کی۔ اپنی بیماری کا اظہار کر کے بیٹے کو کیسے تکلیف دے، مامتا پاک اور بے غرض محبت کا انتہائی درجی ہے۔ آواز کو ہلکا بنا کر بولی نہیں بیٹا بیمار تو نہیں ہوں آج ذرا حرارت ہو آئی تھی۔ شام تک بالکل اچھی ہو جاؤں گی۔ الماری میں حلوہ رکھا ہوا ہے نکال لو۔ نہیں تم آؤ بیٹھو میں ہی نکال دیتی ہو

پرتاپ: ''اماں تم مجھ سے بہانہ کرتی ہو، تم ضرور بیمار ہو، ایک دن میں کوئی اتنا دبلا

نہیں ہو جاتا''

سباما: (ہنس کر) ''کیا دیکھنے میں میں دبلی ہوگئی ہوں مجھے تو معلوم نہیں ہوتا''

پرتاپ: ''میں ڈاکٹر صاحب کے یہاں جاتا ہوں''

سباما: (پرتاپ کا ہاتھ پکڑ کر) ''تم کیا جانو وہ کہاں رہتے ہیں؟''

پرتاپ: ''پوچھتے پوچھتے چلا جاؤں گا''

سباما کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ اسے پھر چکر آیا اس کی آنکھیں پتھرا گئیں

پرتاپ اس کی یہ حالت دیکھ کر سہم گیا، اور کچھ تو نہ ہو سکا، دوڑا ہوا برجن کے دروازے پر آیا اور کھڑا ہو کر رونے لگا۔

ہر روز وہ اس وقت تک برجن کے گھر پہنچ جایا کرتا تھا۔ آج جو دیر ہوئی تو وہ گھبرائی ہوئی ادھر ادھر پھر رہی تھی۔ یکا یک جو دروازہ پر جھانکنے آئی تو پرتاپ کو دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے دیکھا۔ پہلے تو سمجھی کہ اس نے دل لگی سے منہ چھپالیا ہے۔ مگر جب اس کے ہاتھ اٹھائے تو آنسو نظر آئے۔ چونک کر بولی ''کیوں روتے ہو؟ بتا دو''

پرتاپ نے کچھ جواب نہ دیا بلکہ اور سسکنے لگا

برجن: ''نہ بتاؤ گے، کیا چچی نے کچھ کہا ہے؟ کہ تم چپ نہیں ہوتے''

پرتاپ نے کہا ''نہیں برجن اماں بہت بیمار ہیں''

یہ سنتے ہی برج رانی دوڑی اور چشم زدن میں سباما کے سرہانے آ کھڑی ہوئی۔ دیکھا تو وہ بے حس و حرکت پڑی ہے۔ آنکھیں بند ہیں اور سانس زور زور سے چل رہی ہے، ہاتھ پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی۔ ''چچی کیسا جی ہے، آنکھیں کھولو''

مگر چچی نے آنکھیں نہ کھولیں، تب اس نے طاق پر سے تیل اتارا اور سباما کے سر میں ڈال کر آہستہ آہستہ ملنے لگی۔ اس غریب کے سر میں مہینوں سے تیل پڑنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ ٹھنڈی پہنچی تو آنکھیں کھل گئیں۔

برجن: ''چچی کیا جی ہے؟ کہیں درد تو نہیں؟''

سباما: ''نہیں بیٹی درد کہیں نہیں ہے، اب میں بالکل اچھی ہوں، بھیا کہاں ہے؟''

برجن: ''وہ تو میرے گھر ہیں بہت رو رہے تھے''

سباما: ''تم جاؤ اس کے ساتھ کھیلو، اب میں بالکل اچھی ہوں''

برجن: ''میں ابھی نہ جاؤں گی، جب تم اچھی ہو جاؤ گی تب جاؤں گی؟''

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سوشیلا بھی داخل ہوئی۔ اسے سباما سے ملنے کا تو بہت دنوں سے اشتیاق تھا مگر موقع نہ ملتا تھا۔ اس وقت عیادت کے بہانے سے آ پہنچی۔ برجن نے اپنی ماں کو دیکھا تو اچھل پڑی اور تالی بجا بجا کر کہنے لگی ''اماں آئیں، اماں آئیں''

دونوں عورتوں میں شکوہ شکایت ہونے لگی۔ باتوں باتوں میں چراغ جل گیا۔ کسی کو خیال بھی نہ گزرا کہ پرتاپ کہاں ہے۔ کچھ دیر تو وہ دروازے پر کھڑا روتا رہا۔ پھر یکا یک آنکھیں پونچھ کر ڈاکٹر کے مکان کی طرف لپکا۔ ڈاکٹر منشی سالگرام کے دوستوں میں سے تھے۔ اور جب کبھی ضرورت ہوتی وہی بلائے جاتے۔ پرتاپ کو صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ برنا ندی کے کنارے لال بنگلے میں رہتے ہیں۔ اسے اب تک اپنے محلے سے باہر نکلنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ مگر اس وقت فرزندانہ جوش کی بےقراری میں اسے ان رکاوٹوں کا مطلق دھیان نہ آیا۔ گھر سے نکل کر بازار میں آیا اور ایک یکہ والے سے بولا لال بنگلے چلو گے؟ لال بنگلہ مشہور جگہ تھی۔ یکہ والا تیار ہو گیا اور آٹھ بجتے ہی ڈاکٹر صاحب کی فٹن سباما کے دروازے پر آ پہنچی۔ یہاں اس وقت چاروں طرف اس کی تلاش ہو رہی تھی۔ کہ دفعتاً وہ متانت کے ساتھ قدم بڑھاتا ہوا اندر آ گیا اور بولا پردہ کرو ڈاکٹر صاحب آتے ہیں۔

سباما اور سوشیلا دونوں چونک پڑیں۔ سمجھ گئیں کہ ڈاکٹر صاحب کو بلانے چلا گیا تھا۔ سباما نے فرط محبت سے اسے گود میں بٹھا لیا، اور آنکھوں میں آنسو بھر کر پوچھنے لگی ''کیا اکیلے چلے گئے تھے۔ تمہیں راستہ کیسے معلوم ہوا۔ ڈر نہیں لگا؟ ہم سے بتلایا بھی نہیں

یونہی چلے گئے۔تم کھو جاتے تو میں کیا کرتی۔ایسا لعل کہاں پاتی؟'' یہ کہہ کر اس نے بیٹے کو بار بار چوما۔پرتاپ ایسا خوش تھا گویا امتحان میں پاس ہو گیا۔ذرا دیر میں پردہ ہوا اور ڈاکٹر صاحب آئے۔سبھا کی نبض دیکھی اسے تشفی دی۔پرتاپ کو گود میں بٹھا کر باتیں کرتے رہے۔دوا ساتھ لیتے آئے تھے۔اسے پلانے کی تاکید کر کے نو بجے اپنے بنگلے کو واپس چلے گئے۔مگر چونکہ بخار پرانا تھا،اس لیے پورے پورے مہینے بھر سبھا کو کڑوی کڑوی دوائیں پینی پڑیں۔ڈاکٹر صاحب دونوں وقت آتے اور ایسی توجہ سے اور شفقت سے پیش آتے گویا سبھا ان کی بہن ہے۔

ایک دفعہ ڈرتے ڈرتے سبھا نے فیس کے روپے ایک طشتری میں رکھ کر پیش کیے۔مگر ڈاکٹر صاحب نے انہیں ہاتھ تک نہیں لگایا۔صرف اتنا کہا'' اسے میری طرف سے پرتاپ کو دے دیجئے۔وہ پاؤں پاؤں مدرسے جاتا ہے۔پیر گاڑی مول لے لے گا''

برجن اور اس کی ماں دونوں آٹھوں پہر اس کی تیمارداری کے لیے حاضر رہتیں۔ماں چاہے تساہل بھی کر جائے مگر برجن وہاں سے ایک دم کو بھی نہ ہٹتی۔دوا پلاتی،پانی دیتی جب سبھا کی طبیعت ہلکی ہوتی تو اس سے بھولی بھالی باتیں کر کے اس کا دل بہلاتی۔کھیلنا کودنا سب چھوٹ گیا۔جب سبھا بہت اصرار کرتی تو ذرا دیر کے لیے پرتاپ کے ساتھ باغیچے میں کھیلنے چلی جاتی۔چراغ جلتے ہی پھر آ بیٹھتی اور جب تک مارے نیند کے آنکھیں جھک جھک نہ پڑتیں وہاں سے اٹھنے کا نام نہ لیتی۔بلکہ اکثر وہیں سو جاتی۔رات کو آرمی گود میں اٹھا کر گھر لے جاتے۔نا معلوم اسے ایسی کیا دھن سوار تھی۔

ایک دن برج رانی سبھا کے سرہانے بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی۔نہ جانے کس خیال میں غرق تھی کہ آنکھیں دیوار کی طرف لگی ہوئی تھیں اور جس طرح درختوں پر چاندنی لہراتی ہے اسی طرح ہلکی ہلکی مسکراہٹ اس کے لبوں پر مسکرا رہی تھی اسے مطلق خبر نہ

ہوئی کہ چچی میری طرف تاک رہی ہیں۔ دفعتاً اس کے ہاتھ سے پنکھیا چھوٹ پڑی۔ جوں ہی وہ اسے اٹھانے کے لیے جھکی کہ سباما نے اسے پیار سے گلے لگا لیا اور چمکار کر پوچھا ''برجن سچ بتلاؤ تم ابھی کیا سوچ رہی تھیں؟''

برجن نے سر جھکا لیا اور کچھ شرما کر بولی ''کچھ نہیں تمہیں نہ بتلاؤں گی''

سباما: (چمکار کر) ''میری اچھی برجن بتا دے کیا سوچتی تھی؟''

برجن: (لجاتے ہوئے) ''سوچتی تھی کہ جاؤ ہنسومت نہ بتلاؤں گی''

سباما: ''اچھا نہ ہنسوں گی بتاؤ۔ لے یہی تو اب اچھا نہیں لگتا، پھر میں آنکھیں بند کر لوں گی''

برجن: ''کسی کو کہو گی تو نہیں؟''

سباما: ''نہیں کسی سے نہ کہوں گی''

برجن: ''سوچتی تھی کہ جب پرتاپ سے میرا بیاہ ہو جائے گا تو خوب مزے سے رہوں گی''

سباما نے اسے سینے سے چمٹا اور بولی ''پیاری وہ تو تیرا بھائی ہے''

برجن: ''ہاں بھائی ہے، میں جان گئی ہوں، تم مجھے بہو نہ بناؤ گی''

سباما: ''آج للو کو آنے دو، اس سے پوچھوں گی، دیکھوں کیا کہتا ہے''

برجن: ''نہیں نہیں ان کو نہ کہنا، میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں''

سباما: ''میں تو کہہ دوں گی''

برجن: ''تمہیں ہماری قسم ان سے نہ کہنا''

5

شریفانہ زندگی کے نظارے

دن گزرتے گئے۔ دو سال گزر گئے۔ پنڈت موٹے رام روز علی الصبح آتے اور سدھانت کومدی پڑھاتے۔ حالانکہ اب ان کا آنا محض رسماً تھا، کیونکہ اس کتاب

کے پڑھنے میں برجن کا دل بالکل نہ لگتا تھا۔ ایک روز انجینئر کے دفتر سے آئے۔ کمرے میں بیٹھے، نوکر جوتے کا فیتہ کھول رہے تھے کہ رادھیا مسکراتی ہوئی گھر سے نکلی۔ اور ان کے ہاتھ میں ایک سربمہر لفافہ رکھ دیا اور منہ پھیر کر ہنسنے لگی۔ سرنامہ پر لکھا ہوا تھا۔ ''بخدمت جناب بابا صاحب برسد''

منشی: ''ارے تو کس کا خط لے آئی ہے، یہ میرا نہیں ہے''

مہری: ''سرکار کا ہی تو ہے۔ کھولیں تو آپ''

منشی: ''کس نے دیا کوئی آدمی باہر سے آیا تھا''

مہری: ''آپ کھولیں گے تو پتہ لگ جائے گا''

منشی جی نے حیرت میں آ کر لفافہ کھولا، تو یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔

''بابو کو برجن کا پرنام اور پالاگن پہنچے۔ یہاں آپ کی کرپا سے کشل منگل ہے اور آپ کا کشل منگل شری وشوا ناتھ جی سے بدا منایا کرتی ہوں۔ میں نے پرتاپ سے بھاشا سیکھ لی۔ وہ اسکول سے آ کر شام کو مجھے پڑھاتے ہیں۔ آپ ہمارے لیے اچھی اچھی کتابیں لائیے، کیونکہ پڑھنا ہی زندگی کا سکھ ہے اور ودیا انمول چیز ہے۔ وید پران میں اس کا مہاتم لکھا ہوا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ ودھیا دھن دل و جان سے جمع کرے۔ ودیا سے سب دکھ دور ہو جاتے ہیں۔ میں نے کل بیتال پچیسی کی کہانی سنائی، تو انہوں مجھے بہت خوبصورت گڑیا انعام دی ہے۔ بہت اچھی ہے، میں اس کا بیاہ کروں گی، تب آپ سے روپیہ لوں گی، میں اب پنڈت جی سے نہ پڑھوں گی۔ کیونکہ اماں نہیں جانتی کہ میں بھاشا پڑھتی ہوں''

آپ کی پیاری

''برجن''

القاب دیکھتے ہی منشی جی کے کلیجے میں گدگدی محسوس ہونے لگی۔ پھر تو ایک ہی نظر میں سارا خط پڑھ ڈالا، مارے خوشی کے ننگے پاؤں ہنستے ہوئے اندر دوڑ پڑے۔

پرتاپ کو گود میں اٹھالیا اور دونوں بچوں کا ہاتھ پکڑے ہوئے سوشیلا کے پاس گئے اور خط دکھا کر کہا ''بوجھو خط کس کا ہے؟''

سوشیلا: ''لاؤ ہاتھ میں دو، دیکھوں''

منشی جی: ''نہیں وہیں سے بیٹھے بیٹھے بتاؤ جلدی''

سوشیلا: ''بوجھ جاؤں تو کیا دو گے؟''

منشی جی: ''پچاس روپے دودھ کے دھوئے ہوئے''

سوشیلا: ''پہلے روپیہ نکال کر رکھ دو، نہیں تو مکر جاؤ گے''

منشی جی: ''مکرنے والے کو کچھ کہتا ہوں، ابھی روپیہ لو، ایسا کوئی ٹٹ پونجیا سمجھ لیا ہے؟''

یہ کہہ کر دس روپیہ کا ایک نوٹ جیب سے نکال کر دکھایا۔

سوشیلا ''کتنے کا نوٹ ہے؟''

منشی جی: ''پچاس روپیہ کا، ہاتھ میں لے کر دیکھو''

سوشیلا: ''لے لوں گی، کہے دیتی ہوں''

منشی جی: ''ہاں ہاں لے لینا، پہلے بتاؤ تو سہی''

سوشیلا: ''للو کا ہے، لائیے نوٹ، اب میں نہ مانوں گی''

یہ کہہ کر وہ اٹھی اور منشی جی کا ہاتھ پکڑ لیا

منشی جی: ''ایسی کیا رہزنی ہے، نوٹ چھینے لیتی ہو''

سوشیلا: ''زبان نہیں دی تھی کہ ابھی سے مکرنے لگے''

منشی جی: ''تم نے بوجھا بھی؟ صاف دھوکا کھا گئیں''

سوشیلا: ''بہانہ کرتے ہو چلو چلو، کیا نوٹ ہضم کرنے کی نیت ہے؟''

''کیوں للو یہ خط تمہارا ہی ہے نہ؟''

پرتاپ نے نیچی نگاہوں سے منشی کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا ''میں نے

کہاں لکھا؟''

منشی جی: ''شرماؤ، شرماؤ''

سوشیلا: ''جھوٹ بولتا ہے، اسی کا خط ہے، تم لوگ آپس میں گھڑ کر آتے ہو''

پرتاپ: ''میرا خط نہیں ہے، سچ برجن نے لکھا ہے''

سوشیلا کے منہ سے بے اختیار نکلا ''برجن کا'' اور اس نے دوڑ کر شوہر کے ہاتھ سے خط چھینا اور بھونچک ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ مگر اب بھی یقین نہ آیا۔ برجن سے پوچھا'' کیوں بیٹی یہ تمہارا لکھا ہے'' برجن نے سر جھکا کر کہا ''ہاں'' یہ سنتے ہی ماں نے اسے گلے سے لگا لیا۔ اب آج سے برجن کا یہ حال ہو گیا کہ جب دیکھیے برجن قلمدان لیے بیٹھی ہے اور کاغذ سیاہ کر رہی ہے۔ گھر کے کام دھندے سے اسے پہلے ہی کچھ سروکار نہ تھا۔ لکھنا آنا سونے پر سہاگہ ہو گیا۔ ماں اس کی مصروفیات دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی۔ باپ پھولا نہ سماتا تھا۔ نت نئی کتابیں لاتا کہ برجن پڑھ کر ہوشیار ہو جائے گی تو پڑھے گی۔ اگر وہ کبھی اپنا پیر آپ دھو لیتی یا کھانا کھا کر آپ ہی ہاتھ دھونے لگتی تو ماں مہریوں پر برس پڑتی '' آنکھیں پھوٹ گئیں ہیں، چربی چھا گئی ہے۔ وہ اپنے ہاتھ سے پانی انڈیل رہی ہے اور تم کھڑی تاکتی ہو''

اسی طرح دن گزرتے گئے۔ برجن کا بارہواں سال پورا ہو گیا۔ مگر ابھی تک اسے چاول ابالنے کا شعور نہیں تھا۔ چولہے کے سامنے بیٹھنے کا کبھی اتفاق ہی نہیں ہوا۔ سباما نے ایک دن اس کی ماں سے کہا

''بہن برجن سیانی ہوئی، کیا کچھ ڈھنگ نہ سکھاؤ گی؟''

سوشیلا: ''جی تو چاہتا ہے کہ لگا لگاؤں مگر کچھ سوچ کر رہ جاتی ہوں''

سباما: ''کیا سوچ کر رہ جاتی ہو؟''

سوشیلا: ''کچھ نہیں آلکس آ جاتا ہے''

سباما: ''تو یہ کام میرے سپرد کرو، کھانا پکانا عورتوں کے لیے سب سے ضروری بات